اصلاحِ نفس اور تبلیغِ احمدیت میں کامیابی حاصل کرنے کا گُر

(فرمودہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۷ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

انسانی فطرت ہمیشہ ہی ہدایت کی جستجو میں رہتی ہے اور یہ ایک ایسا یقینی اور قطعی امر ہے کہ اس کے متعلق کبھی بھی ایک عقلمند اور غور وفکر کرنے والا انسان شبہ میں نہیں رہ سکتا۔ لیکن باوجود اس کے انسانی تعصّبات اتنے بڑھ گئے ہیں اور عارضی پردے انسان کی عقل پر اتنے پڑ گئے ہیں کہ بِالعموم ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق بدظنی کی طرف مائل رہتا ہے اور اگر اسے دوسرے کی کوئی نیکی معلوم ہوتی ہے تو وہ اُس کو منافقت کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ یہ حالت دماغی ہمیشہ ہی فتنے اور فساد پیدا کرتی چلی جاتی ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت سے محروم بھی کر دیتی ہے بلکہ مایوسی پیدا ہی اِسی وجہ سے ہوتی ہے۔ مایوسی اور بدظنی لازم وملزوم ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو خاص طور پر تاکید فرمائی ہے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی [1] کہ تُو لوگوں کو ہمیشہ سمجھا تا رہ کیونکہ دنیا کا مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے اور تجربہ اس کا شاہد کہ ہمیشہ ہی انسان کو نصیحت کرنے اور سمجھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِسی مایوسی کو دور فرمایا ہے کہ گھروں میں بیٹھے بیٹھے بعض لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ لوگ ہماری باتیں نہیں سُنیں گے اور اگر سُنیں گے تو توجہ نہیں کریں گے۔ اور اگر توجہ کریں گے تو ان کو قبول نہیں کریں گے اور نہ وہ صحیح راستہ جو انہیں بتایا جائے گا اسے اختیار کریں گے اور اگر انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا اور ہماری بات کو مان بھی لیا تو صداقت کو عَلَی الْاِعْلَان قبول کرنے کی جرأت نہیں

کریں گے۔ یہ چار خیالات انسان آپ ہی اپنے ذہن میں پیدا کر لیتا اور پھر اپنے نفس کو یہ کہتے ہوئے خوش کر لیتا ہے کہ میں نے لوگوں کی ہدایت کیلئے پورا زور لگا لیا۔ حالانکہ یہ انسانی فطرت پر بدگمانی ہے اور ایسا خیال کرنا واقعات کے بھی خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر جستجو کا مادہ رکھا ہوا ہے اور چونکہ یہ طبعی مادہ ہے اس لئے کوئی بھی اس سے محروم نہیں۔ انسان خواہ ہندو ہو خواہ عیسائی، خواہ یہودی ہو خواہ مجوسی اندرونی طور پر اُس کا دل چاہتا ہے کہ مَیں صحیح راستہ اختیار کروں۔ لیکن بدظنیاں، شِقاق، لڑائیاں اور صحیح ذرائع کا بہم نہ پہنچنا اُس کو بُرائی کی طرف مائل کر دیتے یا ہدایت سے کلیۃً محروم کر دیتے ہیں۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ** [۲] یا ایک حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ **کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃَ الْاِسْلَامِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ** [۳] کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ فطرتِ صحیحہ یا فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے۔ فطرتِ اسلامی پر پیدا ہونے کے یہی معنی ہیں کہ فطرتی طور پر اُس کے اندر یہ خوبی رکھی جاتی ہے کہ سچائی کے آگے سر جھکا دے۔ کیونکہ اسلام کے معنی اطاعت و اِنقیاد کے ہیں۔ پس ہر بچہ کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات داخل کی ہے کہ وہ سچائی کے آگے سر جھکا دے۔ مگر جب وہ بڑا ہوتا ہے تو **فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ** ۔ اُس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یعنی اس کی فطرت پر دوسرا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور جب اس کے سامنے ایسے عقائد بیان کئے جاتے ہیں جو فطرتِ صحیحہ کے خلاف ہوتے ہیں تو وہ اسی رَو میں بہہ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فطرتِ انسانی میں نیکی رکھی گئی ہے اور وہ کبھی نہیں بدلتی۔ ہاں عارضی پردہ اس پر پڑ جائے تو فطرت کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ مگر جب بھی وہ پردہ اس سے اُٹھا دیا جائے فطرت اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ جب ایک شخص بعد میں یہودی یا عیسائی یا مجوسی بن جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ فطرت بھی بدل جاتی ہے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ **فَاَبَوَاہُ یُغَیِّرَانِ فِطْرَتَہٗ** کہ اُس کے ماں باپ اس کی فطرت کو بدل دیتے ہیں بلکہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے کہ **فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ** کہ اس کے ماں باپ کے اثرات کی وجہ سے وہ یہودی ہو جاتا ہے یا عیسائی ہو جاتا ہے یا مجوسی ہو جاتا ہے۔ اب یہودی، عیسائی یا مجوسی ہو جانا اور چیز ہے اور فطرتِ انسانی کا بدلنا اور چیز ہے۔ فطرت کے متعلق رسول کریم ﷺ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ پہاڑ کا ایک جگہ

سے دوسری جگہ چلا جانا آسان ہے مگر فطرت کا بدلنا مشکل ہے۔ گویا رسول کریم ﷺ نے بتا دیا کہ جب میں کہتا ہوں کہ فطرتِ صحیحہ کے باوجود انسان میں تبدیلی ہو جاتی ہے تو اس تبدیلی سے سطحی تبدیلی مراد ہوتی ہے ورنہ فطرت وہیں قائم رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے عورتیں برقعہ پہن لیتی ہیں۔ اب اگر ایک عورت برقعہ پہنے اور کوئی شخص اس کے برقعہ کو دیکھ کر کہے کہ اس کی آنکھیں بھی ماری گئی ہیں اور اس کا چہرہ بھی مسخ ہو گیا ہے تو ہر شخص اسے بیوقوف کہے گا۔ کیونکہ ان چیزوں پر برقعہ کے ذریعہ صرف پردہ پڑا ہوتا ہے ورنہ چیزیں اصل میں موجود ہوتی ہیں۔ اسی طرح بچہ ماں باپ کے اثرات کے نتیجہ میں یہودیت یا نصرانیت یا مجوسیت کا برقعہ پہنتا ہے، فطرت نہیں بدلتی۔ کیونکہ پہاڑ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا ہے مگر فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو فطرتِ انسانی اسی جگہ قائم رہتی ہے البتہ ماں باپ اس کی عادات میں تبدیلی کر دیتے ہیں، اس کے سطحی خیالات میں تبدیلی کر دیتے ہیں اور وہ ایک دھوکے میں آ جاتا ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ نے تو سردی اور گرمی کا الگ الگ موسم بنایا ہوا ہے مگر جب کسی کو ملیریا چڑھتا ہے تو اسے سخت گرمی میں بھی سخت سردی محسوس ہونے لگ جاتی ہے۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ اس کی فطرت بدل گئی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مرض ہے جس کی وجہ سے اس کے اعصاب میں کمزوری واقع ہو گئی ہے، ورنہ اس کی فطرت نہیں بدلی۔ چنانچہ جونہی اس کا بخار اترتا ہے فوراً اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض بخار ایسے ہوتے ہیں جن میں سخت گرمی محسوس ہوتی ہے۔ سردی کے ایام ہوتے ہیں لوگ آگ تاپ رہے ہوتے ہیں۔ سردی کے مارے ٹھٹھرے جا رہے ہوتے ہیں مگر مریض کہہ رہا ہوتا ہے مجھے آگ لگ گئی، میرے کپڑے اُتار دو۔ بلکہ بعض امراض تو ایسے ہیں جو بہت لمبے چلے جاتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں بیمار سردی کے ایام میں سوتے وقت لحاف سے اپنا پاؤں باہر نکال لیتا ہے۔ ایسے ایسے مریض کو جب بھی دیکھو گے تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ اپنا سارا جسم لحاف سے ڈھک لے گا مگر پیر نہیں ڈھکے گا۔ حالانکہ دوسرے لوگوں کو اس وقت سخت سردی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور سردی سے اُن کے پیر سُن ہو رہے ہوتے ہیں۔ اب اس کے یہ معنے نہیں کہ دنیا سے سردی مٹ گئی یا گرمی جاتی رہی بلکہ درحقیقت اس شخص کی فطرت پر ایک پردہ پڑ جاتا ہے۔ جب وہ پردہ دور کر دیا جاتا ہے تو وہ فوراً اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے۔

پس رسول کریم ﷺ نے ان دونوں مضمونوں کو بیان کر دیا اور فرمایا کہ بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے یا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ فطرت ایسی چیز ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ اور جب ہر بچہ

فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے تو کسی وقت انسانوں کی انسانیت سے مایوس ہو جانا محض حماقت اور نادانی ہے۔ یہی مایوسی جب اپنی ذات کے متعلق پیدا ہوتی ہے تو انسان گناہوں میں بڑھ جاتا ہے اور یہی مایوسی جب دوسرے لوگوں کے متعلق اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے تو وہ تبلیغ چھوڑ دیتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ سے مایوس ہو کر اپنے نفس کی اصلاح ترک کر دیتا ہے وہی وقت اُس کی اصلاح اور روحانی ترقی کا ہوتا ہے۔ مگر وہ عین وقت پر اپنی کوششوں کو چھوڑ دیتا اور اس طرح عظیم الشان نیکیوں کے حصول سے کلیۃً محروم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

قسمت تو میری دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

یہی اس شخص کی مثال ہوتی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور کرتا ہے اور کرتا چلا جاتا ہے مگر جس وقت اُس پر فضل نازل ہونے والا ہوتا ہے اور تاریکی وظلمت کا پردہ اُٹھنے والا ہوتا ہے وہ کہتا ہے مجھ سے اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر ہمیشہ کیلئے گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان گناہوں میں کتنا ہی ملوث کیوں نہ ہوا گر وہ یہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ میں گناہوں سے بچوں اور اسی کوشش میں اُس کی موت واقع ہو جائے تو جہاں تک مَیں نے اسلام اور قرآن کا مطالعہ کیا ہے میرا مذہب یہی ہے کہ وہ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق ہوگا، سزا کا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ واقعہ میں گناہوں کی دلدل میں پھنس گیا تھا اور اس نے اس دلدل سے نکلنے کی پوری کوشش کی اور کوشش کرتا چلا گیا اور اسی حالت میں اُسے موت آ گئی تو موت پر اُس کا کیا اختیار تھا کہ وہ اُسے روک سکتا۔ یہ موت خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس پر آئی اور اِس موت کے آ جانے کی وجہ سے وہ گناہوں کی دلدل سے نکلنے سے محروم رہا۔ ورنہ اگر موت نہ آتی تو ممکن تھا وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا۔ پس چونکہ موت خدا تعالیٰ کی طرف سے آئی اور اس پر ایسی حالت میں آئی جبکہ گناہوں سے نکلنے کی وجہ پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ اسے یہ کہے کہ جا جہنم میں۔ کیونکہ اس صورت میں اس کے جہنم میں جانے کا باعث خدا تعالیٰ کا فعل ہوگا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) اس کا نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ سے گناہوں پر دلیری پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ فیصلہ کرنا کہ وہ گناہوں کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا یا نہیں، خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ انسان کو کیا پتہ کہ میں

واقعہ میں گناہوں کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں یا اگر چاہوں تو ان سے بچ سکتا ہوں۔ پس چونکہ یہ فیصلہ خدا تعالیٰ نے کرنا ہے اس لئے گناہوں پر یہ دلیر نہیں ہوسکتا۔ غرض جو شخص گناہوں سے بچنے کی سچے طور پر کوشش کرتا ہے اور اسی کوشش میں مر جاتا ہے وہ یقیناً نیک لکھا جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے وہ لوگ جو جرمن، انگلستان اور فرانس کی لڑائی میں مارے گئے۔ گو انہوں نے فتح نہیں دیکھی مگر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فتح انہی لوگوں کے ہاتھ سے ہوئی ہے جو زندہ رہے ہیں۔ بلکہ فتح کا سہرا جس طرح زندوں کے سر رہتا ہے اسی طرح ان لوگوں کے سر بھی رہتا ہے جو جنگ کی حالت میں مارے گئے۔ چنانچہ قوموں نے اس کا عملی رنگ میں اعتراف کرتے ہوئے جنگ عظیم کے بعد قومی فتح کا نشان یہی قرار دیا کہ جنگ میں مرنے والے ایک مُردہ کو ایک خاص جگہ گاڑ دیا گیا۔ جہاں سال میں ایک دفعہ وہ بھاری میلہ کرتے ہیں اور بادشاہ تک وہاں جاتا ہے۔ اسی طرح ان قوموں نے تسلیم کیا ہے کہ ہماری فتح ان مرنے والوں کے ذریعہ ہوئی ہے جنہوں نے اپنی جانیں قوم اور ملک کیلئے قربان کر دیں۔ اسی طرح جو شخص شیطان سے لڑتا ہوا مارا جاتا ہے، خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کی حیثیت شکست خوردہ انسان کی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی حیثیت اُس شخص کی سی ہوتی ہے جو لڑائی میں مارا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت احادیث سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بہت سے گناہ کئے مگر آخر اس کے دل میں توبہ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس زمانہ میں رائج خیال یہی تھا کہ توبہ بغیر علماء کی اجازت کے قبول نہیں ہوسکتی۔ یہ خیال یہودیوں اور عیسائیوں میں اب تک پایا جاتا ہے بلکہ عیسائیوں میں تو یہ خیال اتنا غالب ہے کہ ان کے نزدیک پادری کے سامنے اقرارِ جرم کئے بغیر انسان بخشا ہی نہیں جاتا۔ ہماری طرح ان میں یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے روئیں اور معافی طلب کریں۔ بلکہ ان میں یہ ضروری تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان پادری کے سامنے توبہ کرے۔ اسی قومی رواج کے مطابق وہ مختلف علماء کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں نے یہ یہ گناہ کئے ہیں، اب میں توبہ کرنا چاہتا ہوں کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ جب وہ کسی عالم کو اپنا واقعہ سناتا تو وہ کہتا کہ تیری توبہ قبول نہیں ہوسکتی۔ اگر تیرے جیسے انسان کی توبہ قبول کر لی جائے تو دنیا میں گناہ کی انتہا نہ رہے۔ وہ چونکہ علاوہ اور گناہوں کے قتل کا بھی مرتکب رہ چکا تھا اور بڑا بھاری قاتل تھا اس لئے وہ کہتا کہ اگر میری توبہ قبول نہیں ہوسکتی تو میں تم کو بھی زندہ نہیں رہنے دیتا۔ چنانچہ وہ اسے قتل کر دیتا۔ پھر وہ دوسرے کے پاس گیا، پھر تیسرے کے پاس گیا، پھر چوتھے کے پاس گیا مگر سب اُس کی

توبہ قبول کرنے سے انکار کرتے رہے اور وہ ہر ایک کو قتل کرتا گیا۔ آخر لوگوں نے اسے کہا کہ تُو توبہ کیلئے گھر سے نکلا ہے مگر قتل کرکے اور بھی گنہگار ہوتا جاتا ہے۔ وہ کہنے لگا میں تو توبہ کرتا ہوں مگر لوگ کہتے ہیں تیرے لئے توبہ کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے میں غصہ میں آکر اُنہیں بھی قتل کر دیتا ہوں۔ آخر لوگوں نے اُسے کہا کہ فلاں علاقہ میں ایک شخص ہے تُو اُس کے پاس جا امید ہے کہ وہ تیری توبہ قبول کرلے گا۔ جب وہ چلا تو ابھی وہ راستہ میں ہی تھا کہ اُس کی جان نکل گئی۔ اِس پر ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا شروع ہوگیا۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ ہم اس کی روح دوزخ میں لے جائیں گے کیونکہ یہ گنہگار تھا۔ مگر ملائکہ رحمت کہتے کہ یہ توبہ کرنے کیلئے جارہا تھا پس ہم اسے جنت میں لے جائیں گے۔ آخر اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا کہ کس کی بات صحیح ہے اور اس شخص کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم یہ دیکھو کہ وہ اس مقام کے زیادہ قریب ہے جہاں توبہ کرنے جارہا تھا یا اس مقام کے زیادہ قریب ہے جہاں سے وہ گناہ کرکے نکلا تھا۔ جب ملائکہ ان جگہوں کو ماپنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اُس راستہ کو جو توبہ کا تھا چھوٹا کردیا مگر اُس راستہ کو جو گناہ والا تھا لمبا کردیا اور فرمایا کہ چونکہ یہ توبہ کے مقام کے زیادہ قریب ہے اِس لئے اِس کی توبہ قبول کی جاتی ہے، اسے جنت میں لے جایا جائے۔[۴] اس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ اور اس کے ملائکہ کے درمیان ضرور اس قسم کی باتیں ہوئی ہوں۔ یہ اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے مرجاتا ہے تو ملائکہ تردّد میں پڑ جاتے ہیں۔ ملائکہ تو احکامِ الٰہی کی اطاعت کیا کرتے ہیں تردّد کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جس وقت کوئی جان توبہ کی کوشش کرتے ہوئے نکلتی ہے اور بظاہر حقیقی توبہ اُسے نصیب نہیں ہوتی تو ملائکہ میں ایک اضطراب سا پیدا ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو جنت کا مستحق ہے دوزخ کا نہیں اور پھر خدا تعالیٰ بھی انہی کی تائید کرتا ہے۔

غرض انسان جب اپنی فطرت سے مایوس ہوجاتا ہے تو گناہ میں بڑھ جاتا ہے۔ اور جب دوسروں سے مایوس ہوجاتا ہے تو تبلیغ میں سُست ہوجاتا ہے۔ کئی لوگ ہیں جو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں حق تو یہی ہے مگر لوگ مانتے نہیں۔ میں ہمیشہ ان سے کہتا ہوں کہ اگر لوگ واقعہ میں نہیں مانتے تو ہماری جماعت میں جو لوگ نئے داخل ہوتے ہیں یہ کہاں سے آتے ہیں۔ اگر لوگ اتنے ہی سنگدل اور حقیقت سے بے بہرہ ہوگئے ہیں کہ وہ سچائی کی باتیں سنتے ہیں مگر مانتے نہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ ایک

زمانہ وہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب آپ کے ساتھ ہزاروں آدمی تھے اور اب تو لاکھوں تک پہنچ گئے ہیں۔ پھر کسی زمانہ میں پنجاب میں بھی کوئی شخص آپ کا معتقد نہ تھا۔ اور اب نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے تمام براعظموں میں احمدی پھیل گئے ہیں۔ اگر یہ سچ بات ہے کہ دنیا نہیں مانتی تو پھر اتنے لوگ کہاں سے آ گئے۔ یہیں دیکھ لو اچھے لوگ اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں سے کتنے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ابتدائی زمانہ میں آپ پر ایمان لائے۔ میں سمجھتا ہوں اِس مجمع میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شکل دیکھی۔ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی تصویر دیکھی۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے شکل تو دیکھی مگر آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا انہیں موقع نہ ملا۔ اور بہت قلیل ایسے لوگ ہیں جو غالباً درجنوں سے بڑھ نہیں سکتے جنہوں نے آپ کی باتیں سُنیں اور آپ کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کا انہیں موقع ملا۔ مگر آخر یہ لوگ کہاں سے آئے۔ میری پیدائش اور بیعت قریباً ایک ہی وقت سے چلتی ہے اور جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا اُس وقت کئی سال تبلیغ پر گزر چکے تھے لیکن مجھے اپنے ہوش کے زمانہ میں یہ بات یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سیر کیلئے نکلتے تو صرف حافظ حامد علی صاحب ساتھ ہوتے۔ ایک دفعہ مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسی طرف سیر کیلئے آنا یاد ہے۔ میں اُس وقت چونکہ چھوٹا بچہ تھا اس لئے میں نے اصرار کیا کہ میں بھی سیر کیلئے چلوں گا۔ اُس زمانہ میں یہاں جھاؤ کے پودے ہوا کرتے تھے اور یہ تمام علاقہ جہاں اب تعلیم الاسلام ہائی سکول، بورڈنگ اور مسجد وغیرہ ایک جنگل تھا اور اس میں جھاؤ کے سِوا اور کوئی چیز نہ ہوا کرتی تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اِسی طرف سیر کیلئے تشریف لائے اور میرے اصرار پر مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ مگر تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ میں تھک گیا ہوں۔ اِس پر کبھی مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُٹھاتے اور کبھی حافظ حامد علی صاحب اور یہ نظارہ مجھے آج تک یاد ہے۔ تو وہ ایسا زمانہ تھا کہ گو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دعویٰ تھا مگر آپ کو ماننے والے بہت قلیل لوگ تھے اور قادیان میں آنے والا تو کوئی کوئی تھا لیکن آج یہ زمانہ ہے کہ ہمیں بار بار یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ قادیان میں ہجرت کر کے آنے سے پیشتر لوگوں کو چاہئے کہ وہ اجازت لے لیں اور اگر کوئی بغیر اجازت کے یہاں ہجرت کر کے آئے تو اسے واپس جانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اب آبادی خدا تعالیٰ کے

فضل سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ منافق بھی یہاں کھپ جاتے ہیں۔ پھر جن کو ذرا بھی باہر دشمنوں کی طرف سے تکالیف پہنچتی ہوں اروو ہ ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تو کہتے ہیں چلو قادیان میں ہجرت کر کے چلیں۔اس طرح کمزور ایمان والے بھی قادیان میں اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

غرض اُس وقت یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرّہ بھی ہو اسے چاہئے کہ ہجرت کر کے قادیان آئے اور اب ہمیں شرطیں لگانی پڑتی ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ جس کے دل میں بڑا پختہ ایمان ہو صرف وہ آئے، دوسروں کے آنے کی ضرورت نہیں۔ پھر کجا وہ وقت تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بائیکاٹ کر دیا جاتا۔ برتن بنانے والوں کو آپ کے برتن بنانے سے، سقوں کو آپ کا پانی بھرنے سے اور چوہڑوں کو آپ کے مکانات کی صفائی کرنے سے روک دیا جاتا۔ اور کجا آج یہ حالت ہے کہ قادیان میں ہر پیشے والے کثرت سے احمدی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض پیشوں میں ۸۰۔۹۰ فیصدی اور بعض پیشوں میں سَو فیصدی احمدی ہی احمدی نظر آتے ہیں۔شاید آج سے چند سال پہلے میں یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ہر پیشہ کے احمدی قادیان میں بکثرت موجود ہیں۔ کیونکہ خاکروب جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا احمدی نہیں تھے مگر اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت سے خاکروب بھی احمدی ہیں اور کہا جاسکتا کہ ہر پیشہ کے احمدی قادیان میں موجود ہیں۔ پھر ان علاقوں میں جہاں پھرنے سے وحشت ہوتی تھی اور جھاؤ ہی جھاؤ نظر آتا تھا، وہاں اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے عمارتیں ہی عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور یا ان رستوں پر چلنے سے انسان گھبراتا تھا یا اب یہاں تقریریں ہوتی ہیں اور جلسے ہوتے ہیں۔تو اگر یہ درست ہے کہ انسانی فطرت اتنی گری ہوئی ہے کہ وہ حق بات مانتی نہیں تو یہ لوگ کہاں سے آگئے۔مگر میں نے دیکھا ہے کہ انسان کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ یا افراط کی طرف چلا جاتا ہے یا تفریط کی طرف۔ یا تو وہ کہتا ہے کہ میری اصلاح ہو ہی نہیں سکتی اور یا وہ یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ میں ہی اصلاح کے قابل تھا باقی دنیا اصلاح کے قابل نہیں۔ اِسی طرح اگر اس کے اندر خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری یہ کہاں قسمت ہے کہ مجھے ہدایت حاصل ہو۔اور جب اسے ہدایت مل جاتی ہے تو وہ یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ میں ہی دنیا میں ایک خوش قسمت انسان ہوں۔ میں ہی جنتی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے والا ہوں۔ باقی سب دوزخی اور جہنمی ہیں۔حالانکہ اگر یہ آپ ڈوبتا ہے تب بھی نقصان ہے اور اگر یہ تو بچ جاتا ہے مگر لوگ ڈوب جاتے ہیں تب بھی نقصان ہے۔کمال تو یہ ہے

کہ یہ بھی نہ ڈوبے اور دوسرے لوگ بھی نہ ڈوبیں۔ اور یہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر بھی بدظنی نہ کرے اور دوسرے لوگوں پر بھی بدظنی نہ کرے۔ اگر وہ اپنے آپ پر بدظنی نہ کرے اور اپنے رب پر بھی بدظنی نہ کرے اور وہ یہ سمجھے کہ وہ سخت گیر اور سنگدل نہیں بلکہ رحم کرنے والا اور گنہگار کی توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ مجھے چاہئے کہ میں گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا چلا جاؤں۔ تو اول تو وہ دنیا میں ہی کامیاب ہوجائے گا اور شیطان کے پنجہ سے رہائی پاجائے گا اور اگر دنیا میں کامیاب نہ ہوا اور اسی جدوجہد میں اسے موت آجائے، تب بھی خدا تعالیٰ کا فضل اسے ڈھانپ لے گا۔

غرض انسان اگر اپنے نفس پر بدظنی ترک کردے تو اس سے اس کے گناہ بھی کچھ کم ہوجائیں اور اس کے دل میں کام کرنے کی امنگ اور جوش پیدا ہوجائے۔ اسی طرح اگر وہ دنیا پر حسن ظنی کرے اور کہے کہ اگر مجھے ہدایت مل سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ دوسروں کو نہیں مل سکتی۔ یقیناً جس طرح مجھے ہدایت ملی اسی طرح دوسروں کو بھی ہدایت مل سکتی ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ ان کو تبلیغ کرنے سے غافل نہیں ہوگا اور اپنی کوشش میں مشغول رہے گا یہاں تک کہ انہیں ہدایت حاصل ہوجائے گی۔ چنانچہ اس امر کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک وقت صداقت کے شدید ترین دشمن ہوتے ہیں دوسرے وقت میں اسی صداقت کیلئے ہر قسم کی قربانی کرنے والے بن جاتے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ ایک مشہور صحابی گزرے ہیں۔ گو مسلمانوں کا ایک طبقہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہت ذہین اور ہوشیار تھے۔ وہ جب مرض الموت سے بیمار ہوئے تو ایک دوست ان کی عیادت کے لئے گئے اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ وہ یہ سن کر رو پڑے اور کہنے لگے اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مَیں فوت ہوجاتا تو مجھے یقین ہوتا کہ میں بخشا جاؤں گا۔ کیونکہ اُس وقت ہم ہر قسم کے عیبوں سے بچے ہوئے تھے مگر آپ کی وفات کے بعد کئی واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ اب اپنے اعمال کے متعلق مجھے شبہ پیدا ہوگیا ہے (حضرت عمروؓ بن العاص دراصل حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ سے جنگ کرتے رہے تھے اور شاید اِسی کا اُن کی طبیعت پر اثر تھا)۔ پھر کہنے لگے میرا عجیب حال ہے۔ ایک زمانہ مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قابلِ نفرت وجود مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جونہی آپ کا دعویٰ سنا، دل میں آپ سے بغض پیدا ہوگیا اور اِسی بغض کی وجہ سے میں نے آپ کی شکل کبھی نہیں دیکھی بلکہ اتنی نفرت پیدا ہوگئی اتنی نفرت پیدا ہوگئی کہ میں کبھی یہ پسند

نہ کرتا کہ میں اور رسول کریم ﷺ ایک جگہ جمع ہوں ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی اور میں مسلمان ہوگیا تو رسول کریم ﷺ سے مجھے اتنی محبت پیدا ہوگئی اور آپ کی اس قدر عظمت میرے دل میں بیٹھ گئی کہ میں آپ کے جلال اور آپ کے رُعب کی وجہ سے آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ اگر کوئی مجھ سے رسول کریم ﷺ کا حلیہ پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ بُغض کے وقت مجھے آپ سے اتنا بُغض تھا کہ اس بُغض کی شدت کی وجہ سے میں نے آپ کی شکل کبھی نہ دیکھی اور محبت کے وقت مجھے آپ سے اتنی محبت پیدا ہوگئی اور آپ کی اِس قدر عظمت میرے دل پر مستولی ہوگئی کہ آپ کے رُعب اور جلال کی وجہ سے میں نے آپ کی شکل کبھی نہ دیکھی ۔[۵] یہ کتنا عظیم الشان تغیر ہے جو ان میں پیدا ہوا۔ اگر اس قسم کے لوگ پہلے زمانہ میں ہو سکتے تھے تو یقیناً آج بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں ۔

پس مومن کو کبھی بھی فطرتِ انسانیہ پر بدظنی نہیں کرنی چاہئے خواہ وہ بدظنی اپنی ذات کے متعلق ہو اور خواہ دوسرے لوگوں کے متعلق ۔ جب تک ہماری جماعت کے دوست اس نقص کو دور نہ کرلیں اُس وقت تک نہ ان کے گناہ دور ہو سکتے ہیں اور نہ وہ تبلیغ میں پورے جوش سے حصہ لے سکتے ہیں ۔ گناہوں سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان نہ اپنی ذات پر بدظنی کرے اور نہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کرے ۔ دنیا میں مختلف کام مختلف میعاد کے اندر ہوتے ہیں ۔ کوئی دس سال کے اندر ہوتا ہے، کوئی بیس سال کے اندر ہوتا ہے، کوئی تیس سال کے اندر ہوتا ہے، کوئی چالیس سال کے اندر ہوتا ہے، کوئی پچاس سال کے اندر ہوتا ہے ۔ اسی طرح گناہوں سے بھی کوئی جلدی بچ جاتا ہے کوئی دیر میں بچتا ہے اور کوئی بہت ہی دیر میں بچتا ہے ۔ اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ کوشش کرتا چلا جائے ۔ اس سلسلہ میں اس کا اپنی کامیابی دیکھنا ضروری نہیں ۔ ہاں باطنی کامیابی اسے فوراً حاصل ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کو دیکھتا ہے ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ جب کوئی شخص اپنی اندرونی صفائی کیلئے کوشش شروع کر دیتا ہے تو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ اُسی وقت کامیاب سمجھا جانے لگتا ہے گو دنیا کے نزدیک اس کی کامیابی میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پس مومن کو بدظنی کے مرض سے بہت بچنا چاہئے ۔ میں نے قریباً ہر قوم کے لوگوں سے مل کر دیکھا ہے کہ ان میں نیک اور شریف النفس لوگ پائے جاتے ہیں ۔ ہندوؤں سے مجھے جب بھی ملنے کا موقع ہوا ہے میں نے ان کی اکثریت کو شرافت اور نیکی کی خواہش اپنے دل میں رکھنے والی پایا ہے اور ان میں سے اکثر کو سچائی کی جستجو ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر ان کے سامنے سچائی پیش کی جائے تو وہ اس کو قبول کرنے کی جرأت نہ

کر سکتے ہوں۔ کیونکہ دل میں سچائی کے حصول کی تڑپ ہونا اور بات ہے اور سچائی کو کسی روک کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے قبول کر لینا اور بات ہے۔ لیکن بہرحال ملاقاتوں اور خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی ایک تڑپ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روحانیت کہتے ہیں۔ روحانیت خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی تڑپ کا نام ہے۔ جس کے اندر یہ تڑپ تھوڑی ہو اُس میں تھوڑی روحانیت ہوتی ہے اور جس میں یہ تڑپ زیادہ ہو اُس میں زیادہ روحانیت ہوتی ہے اور عدمِ روحانیت اس بات کا نام ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کا خیال انسان کے دل میں نہ ہو۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کے ماتحت کام نہیں کرتا وہ چاہے جتنی بھی نیکی کرے دنیادار کہلاتا ہے۔ مگر وہ شخص جو خدا تعالیٰ کی رضا کیلئے کوئی کام کرتا ہے وہ چاہے کتنی ہی حقیر نیکی کرے دیندار کہلائے گا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس لئے چندہ دیتا ہے کہ اسے نام و نمود اور شہرت حاصل ہو، اُس کا جتھا مضبوط ہو، تو وہ دنیادار کہلائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص صرف ایک پیسہ یا دو پیسے چندہ دیتا ہے مگر اس لئے دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو تو وہ روحانی آدمی کہلائے گا۔ یورپ میں آجکل لاکھوں نہیں کروڑوں روپے صدقہ و خیرات دینے والے موجود ہیں مگر کوئی شخص انہیں روحانی آدمی نہیں کہتا۔ کیونکہ ان کی غرض محض یہ ہوتی ہے کہ ہماری قوم مضبوط ہو جائے۔ ہمارا جتھا بڑا ہو جائے اور ہمیں دنیا میں عزت اور شہرت حاصل ہو جائے۔ اسی لئے وہ باوجود بڑی بڑی رقوم چندہ دینے کے دنیادار کہلاتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کی رضاء اور خوشنودی کیلئے اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی چندہ میں دیتا ہے تو وہ روحانی آدمی کہلاتا ہے۔

تو میرا تجربہ یہ ہے کہ دنیا کے اکثر لوگوں میں روحانیت پائی جاتی ہے سوائے آوارہ گردوں اور اوباشوں کے بلکہ ان میں سے بھی ایک طبقہ ایسا ہے جس کے اندر خشیت اللہ ہوتی ہے۔ لیکن اس طبقہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو حقیقی آوارگی میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کے سِوا دنیا کے ہر شخص میں کچھ نہ کچھ روحانیت ہوتی ہے مگر آوارگی کی تعریف جو میں کرتا ہوں وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔ میں چور کو آوارہ نہیں کہتا، میں ایک بدکار کو بھی آوارہ نہیں کہتا۔ آوارہ میرے نزدیک وہ ہے جو اپنے وقت کو رائیگاں کھوتا اور اسے ہنسی اور مخول میں ضائع کر دیتا ہے۔ ایسے لوگوں میں ہرگز روحانیت نہیں پائی جاسکتی۔ میں نے چوروں میں بھی روحانیت دیکھی ہے، میں نے بدکاروں میں بھی روحانیت

دیکھی ہے مگر میں نے ان لوگوں میں روحانیت نہیں دیکھی جو بیکار بیٹھے رہتے ہیں اور ہاہاہُو ہُو کررہے اور لوگوں پر ہنسی اور تمسخر اُڑا رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ جرم کرنے والوں میں احساسِ گناہ اور احساسِ ندامت زیادہ ہوتا ہے جیسے بعض عبادت کرنے والوں میں کبر پیدا ہوجاتا ہے۔مگر یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ دنیا میں ہر گنہگار میں احساسِ ندامت نہیں ہوتا جیسے ہر عابد میں کبر نہیں ہوتا۔ یہ صرف بعض لوگوں کی قسمیں ہیں۔ بہرحال روحانیت ایک وسیع چیز ہے اور میرے نزدیک ننانوے فیصدی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔صرف ایک فیصدی وہ لوگ ہیں جن پر دنیاداری کامل طور پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور روحانیت کے حصول کی کوئی خواہش ان کے دلوں میں نہیں ہوتی۔مگر ایسے آدمی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں بہت کم ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ دہریہ بھی ایسے نہیں ہوتے۔ دہریہ انسان ایک خاص عمر میں ہوتا ہے۔مگر پھر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی دہریت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ جن دہریوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جو چند سال گزرنے کے بعد اپنی دہریت پر قائم رہا ہو۔ایک نوجوان شخص جو ہندوستانی تھا ولایت میں مجھے ملا۔ وہ اُس وقت دہریت پر اتنا یقین اور وثوق رکھتا تھا کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کے وجود پر ہنسی اور تمسخر اُڑاتا رہتا تھا اور اُس کی دین سے بے بہرگی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ایک دفعہ کہنے لگا ہندوستانی اتنے بیوقوف ہوتے ہیں، اتنے بیوقوف ہوتے ہیں کہ اب مجھے اپنے آپ کو ہندوستانی کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔اس پر ہندوستانیوں کی حماقت کی جو مثال اس نے مجھے سنائی وہ میں آپ لوگوں کو بھی بتاتا ہوں۔اس سے آپ سمجھ سکیں گے کہ اس کی دینی حالت کیا تھی۔ وہ کہنے لگا ہم چند ہندوستانی دوست جب پہلے پہل تعلیم کیلئے ولایت آئے اور مارسیلز میں اُترے تو ایک دوست نے کہا یہاں ایک میوزیم ہے، چلو دیکھ لیں۔ چنانچہ ہم سب میوزیم دیکھنے کیلئے چلے گئے۔مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی ہم وہاں سے ہاہا ہی کرتے اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھاگے۔ میں نے کہا کیا ہوا؟ کہنے لگا وہاں ننگی تصویریں تھی جنہیں ہم دیکھتے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگے۔مگر اب یہ حالت ہے کہ ننگی عورتیں دیکھ کر بھی ہمارے دل میں کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ گویا اس نے بتایا کہ جب ہم ہندوستان سے آئے تھے تو اتنے جاہل تھے، اتنے جاہل تھے کہ ننگی تصویریں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حالانکہ تہذیب کا کمال یہ ہے کہ انسان ننگی عورتوں کو دیکھے تو اس کی آنکھ تک نہ جھپکے۔ یہ اس کے نزدیک تہذیب اور شرافت کا معیار تھا۔مگر دس بارہ سال کے بعد وہ ایک دفعہ مجھے ہندوستان میں ملا، اُس وقت وہ ایک

کالج کا پروفیسر تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا بتاؤ اب تمہاری کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگا مذہبی آدمی تو میں ہوں نہیں لیکن میری اب وہ پہلی حالت نہیں رہی۔ چنانچہ طالب علموں سے پوچھ لیجئے جب خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کوئی اعتراض کرتے ہیں تو میں انہیں کہتا کہ میں بھی ان راستوں سے گزر چکا ہوں۔ مگر میرا تجربہ یہی ہے کہ مذہب کو تسلیم کئے بغیر اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اب دیکھو اُس کی یا تو وہ حالت تھی اور یا یہ حالت ہوگئی۔ مگر اس کے اندر یہ تغیر کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ کے مطابق ایک فطرتی نیکی اس کے اندر موجود تھی جو بعد میں ظاہر ہوگئی۔ گویا فطرت پر پہلے ایک پالش چڑھا ہوا تھا مگر جب وہ پالش اُتر گیا تو فطرت اپنی اصل حالت رونما ہوگئی۔ تو گناہ اور بدی اور افتراء اور جھوٹ یہ ساری چیزیں ملمّع ہیں ورنہ اندرونی طور پر تمام انسان نیک ہوتے ہیں۔ جب تک ہم یہ نکتہ نہ سمجھ لیں کُلّی طور پر ہم اصلاحِ عالَم نہیں کر سکتے۔ یہ تو ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی بداعمالی کی وجہ سے اُس کے متعلق یہ فیصلہ کر دے کہ وہ جہنمی ہے مگر ایسی سزا بھی عارضی ہوگی، مستقل نہیں ہوگی۔ اگر یہ سزا مستقل ہوتی تو جہنم بھی مستقل ہوتا۔ مگر خدا تعالیٰ نے جہنم کو مستقل نہیں رکھا بلکہ جنت کو مستقل رکھا ہے اور اس طرح ہمیں بتایا ہے کہ نیکی مستقل چیز ہے اور بدی عارضی چیز۔

جب ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ایسی اعلیٰ ملی ہے تو یہ کتنے بڑے تعجب کی بات ہوگی۔ اگر وہی قوم جس کے سپرد اصلاحِ عالَم کا کام ہو تھک جائے اور کہے کہ لوگ اس کی بات نہیں مانتے۔ یا اس لئے ہمت ہار کر بیٹھ جائے کہ وہ نیکی حاصل نہیں کر سکتی۔ یا اگر اس نے خود نیکی حاصل کر لی ہے تو وہ دوسروں کے متعلق یہ خیال کر لے کہ وہ نیک نہیں بن سکتے۔ وہ کیوں یہ خیال نہیں کرتی کہ اور لوگ خدا تعالیٰ کے سوتیلے بیٹے نہیں۔ وہ بھی اس کی مخلوق ہیں اور ان سے بھی خدا تعالیٰ محبت اور پیار رکھتا ہے۔ اگر وہ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں تو یقیناً ایک وقت ایسا آجائے گا جبکہ وہ ہدایت پا جائیں گے۔ تو مومن کو اپنی فطرت کی نیکی پر پورا بھروسہ اور یقین رکھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے کہا مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ [۶] بعض لوگ اسے حدیث قرار دیتے ہیں۔ بعض اسے آثار میں سے قرار دیتے ہیں لیکن جو بھی ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں ایک نکتۂ معرفت بیان کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس سے وحدت وجود کا استدلال کرتے ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنی فطرت کو سمجھ لے تو اسے خدا ضرور مل جاتا ہے۔ جب ایک انسان اس یقین پر قائم ہو جائے کہ

میری فطرت خدا تعالیٰ نے نیک بنائی ہے اور مجھے اس نے اس لئے بنایا ہے کہ اس کا وصال مجھے حاصل ہو تو فطرت کو خدا تعالیٰ نے ایسا طاقتور بنایا ہے کہ اس یقین کے بعد وہ شیطان سے شکست نہیں کھا سکتا۔ اور جو شخص شیطان سے نہیں ہارتا جنت اس کا ورثہ ہوتا اور جنت کا وہ ٹھیکیدار ہو جاتا ہے۔ پھر جب اسے اس بات پر یقین ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی بھی اصلاح ہوسکتی ہے تو وہ اس یقین کے بعد دوسروں کیلئے اپنی جان قربان کرنے کیلئے بھی تیار ہو جاتا ہے اور ہر رنگ میں انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش اور سعی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ لوگ بچ جائیں گے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی گھر کو آگ لگی ہوئی ہو اور چاروں طرف سے اس کے شعلے نکل رہے ہوں۔ اور انسان یہ سمجھ لے کہ اب اس گھر کے آدمیوں میں سے ہم کسی کو نکال نہیں سکتے۔ تو وہ واقعہ میں کسی آدمی کو نہیں نکال سکتا۔ لیکن جب کوئی شخص ایک عزم اور ارادہ کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میں کوشش تو کروں ممکن ہے بعض لوگوں کو مَیں نکال لاؤں تو وہ آگ کے اندر داخل ہو کر بعض لوگوں کو واقعہ میں بچا لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو یقین ہو کہ لوگوں کی اصلاح ہوسکتی ہے اور پھر وہ اپنی کوششیں جاری رکھتا ہے تو اس کی تبلیغ بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یقین سے خالی دل لے کر جاتا ہے اور لوگوں کو سمجھاتا ہے تو اس کی تبلیغ میں کیا اثر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ تو تبلیغ کیلئے جاتے ہیں مگر اُن کا دل یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ لوگوں نے تو ماننا ہی نہیں۔ اس طرح جب وہ لوگوں پر بدظنی کرتے ہیں اور اپنے خدا پر بھی بدظنی کرتے ہیں تو ان کی تبلیغ میں کوئی برکت نہیں رہتی اور وہ خالی ہاتھ گھر واپس آ جاتے ہیں۔ آخر کیا فرق ہے انبیاء کی تبلیغ اور دوسرے لوگوں کی تبلیغ میں۔ کیا فرق ہے اولیاء کی تبلیغ اور دوسرے لوگوں کی تبلیغ میں۔ کیا فرق ہے مومنوں کی تبلیغ اور دوسرے لوگوں کی تبلیغ میں۔ فرق یہی ہے کہ مومن جب بولتا ہے تو اس یقین اور وثوق سے بولتا ہے کہ میں دنیا کو ہلا دوں گا۔ میرے سامنے اگر پہاڑ بھی آئے تو میں اسے اُڑا دوں گا۔ اور جو مخالف میرے سامنے ہے اس کی مجال نہیں کہ میرے ہاتھ سے جا سکے۔ وہ میرا شکار ہے جو کہیں اور نہیں جا سکتا۔ میں اس کی بدی کا چولہ پھاڑ دوں گا اور اس کی حقیقی نیکی جو اس کی فطرت میں مرکوز ہے نکال کر باہر رکھ دوں گا۔ لیکن دوسرا جب تبلیغ کرتا ہے تو دل میں یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ میں یونہی تبلیغ کر رہا ہوں ورنہ اس نے ماننا تو ہے نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے قلب کا اثر دوسرے شخص کے قلب پر بھی جا پڑتا ہے اور وہ بھی کہتا ہے کہ یہ بے شک تبلیغ کر لے میں نے اس کی بات نہیں ماننی۔ لیکن دل کے اندر سے نکلی ہوئی بات

دوسرے کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی اور انسان خواہ کس قدر مخالف ہو اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس میں انبیاء اور اولیاء کی کوئی تخصیص نہیں۔ عام مومن پر بھی جب اس قسم کا وقت آتا ہے تو اس کے ذریعہ قلوب میں ایسا تغیر پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

رسول کریم ﷺ کے زمانہ کی ایک مثال ہے جو اس امر کو خوب واضح کر دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ اتنے دشمن کہ وہ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے چل پڑے۔ مگر ابھی رستہ میں ہی تھے کہ کسی نے ان سے پوچھا عمرؓ کہا جا رہے ہو؟ وہ کہنے لگے محمد (ﷺ) کا کام تمام کرنے چلا ہوں۔ اس نے کہا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ وہ کہنے لگا اعتبار نہیں تو گھر جا کر دیکھ لو۔ چنانچہ وہ اپنے بہنوئی کے گھر گئے، دیکھا تو دروازہ بند تھا اور اندر انہوں نے ایک صحابی کو بُلایا ہوا تھا جس سے وہ قرآن مجید سن رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دستک دی، انہوں نے دروازہ کھولا تو حضرت عمرؓ اندر داخل ہو گئے اور پوچھا کہ بتاؤ کیا ہو رہا تھا؟ انہوں نے کہا کچھ نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ کچھ کیوں نہیں کوئی بات ضرورت ہے اور میں نے سنا ہے تم مسلمان ہو چکے ہو۔ یہ کہتے ہوئے وہ غصہ میں آگے بڑھے تا کہ اپنے بہنوئی کو ماریں۔ جب وہ مارنے لگے تو ان کی بہن اپنے خاوند کی محبت کے جوش میں ان کو بچانے کیلئے بیچ میں آ گئیں۔ اہلِ عرب کی یہ فطرت نہیں تھی کہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھائیں۔ مگر حضرت عمرؓ چونکہ اپنے بہنوئی پر ہاتھ اُٹھا چکے تھے اس لئے روک نہ سکے اور ضرب ماردی جو بجائے اپنے بہنوئی کے ان کی بہن کو جا لگی اور ان کے جسم سے خون ٹپکنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان کی بہن جوش میں آ گئیں اور انہوں نے کہا عمرؓ! پھر ہم مسلمان ہو چکے ہیں تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ڈر کی وجہ سے مسلمان عام طور پر ان سے کھل کر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ مگر اُس دن جب انہوں نے یقین اور وثوق سے بھرے ہوئے یہ الفاظ سُنے کہ تم نے جو کرنا ہے کر لو ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور اب اسلام کو ہم ہرگز چھوڑنے کیلئے تیار نہیں۔ تو گویہ الفاظ ایک کمزور فطرت عورت کے منہ سے نکلے تھے جو عام طور پر دوسرے کی حفاظت چاہتی ہے مگر جب اس عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں عورت ہو کر یہ کہتی ہوں کہ اب ہم اسلام پر قائم ہو چکے ہیں تم نے جو کرنا ہے کر لو تو یہ یقین اور وثوق ان کے دل کو کھا گیا اور انہوں نے کہا اچھا مجھے بھی بتاؤ کہ تم کیا سُن رہے تھے۔ انہوں نے کہا تم قسم کھاؤ کہ اس کی بے ادبی نہیں کرو گے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ میں بے ادبی

نہیں کروں گا۔ آخر انہوں نے اُس صحابی کو جسے انہوں نے مکان میں پوشیدہ کر دیا تھا اندر سے بُلایا اور قرآن شریف سنانے کیلئے کہا۔ انہوں نے قرآن کریم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں۔ چونکہ وہ اس سے پہلے اسلام کی صداقت کے متعلق ایک یقین اور وثوق کا نظارہ دیکھ چکے تھے اور وہ یہ یقین بھری تبلیغ سن چکے تھے کہ ہم اپنی جانیں دے دیں گے مگر اسلام کو نہیں چھوڑیں گے اور اس قسم کی تبلیغ انہیں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، اس لئے قرآن کریم سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہاں سے اُٹھ کر سیدھے رسول کریم ﷺ کی مجلس میں پہنچے۔ بعض صحابہ اور رسول کریم ﷺ ایک مکان میں بیٹھے ہوئے تھے اور دروازہ بند تھا کہ حضرت عمرؓ نے دستک دی۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا عمر۔ صحابہ نے کہا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! یہ شخص بڑا خطرناک اور لڑاکا ہے دروازہ نہیں کھولنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی کوئی بے ادبی کرے۔ مگر حضرت امیر حمزہؓ نے جو رسول کریم ﷺ کے چچا تھے اور بڑے بہادر انسان تھے کہا دروازہ کھولو، ڈر کی کونسی بات ہے۔ اور رسول کریم ﷺ نے بھی فرمایا کہ کھول دو۔ جب صحابہ نے دروازہ کھولا تو رسول کریم ﷺ ان کا استقبال کرنے کیلئے دروازہ تک تشریف لے گئے اور جب حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے عمرؓ! کیا اب تک تمہاری ہدایت کا وقت نہیں آیا؟ وہ اُدھر اپنی بہن کے ایمان کا نظارہ دیکھ کر آئے تھے، اِدھر رسول کریم ﷺ کا جب یہ فقرہ انہوں نے سنا تو ان کا جسم سر سے لے کر پیر تک ہِل گیا۔ کیونکہ اس فقرہ میں گو بظاہر دو چار لفظ ہیں مگر کیسا یقین اور وثوق ہے جو ان الفاظ سے ٹپک ٹپک کر ظاہر ہو رہا ہے کہ جس سچائی اور صداقت کو میں لے کر دنیا میں آیا ہوں اسے جلد یا بدیر دنیا مان کر رہے گی اور ہر ایک کا ایک وقت ہے جس میں اسے ہدایت ملے گی۔ مگر اے عمر! کیا تیرا وقت ابھی نہیں آیا؟ اس فقرہ کا سننا تھا کہ حضرت عمرؓ کے دل سے رہی سہی میل بھی دور ہوگئی۔ عمر جیسے سخت گیر انسان پر بے انتہا رقت طاری ہوگئی۔ بے اختیار ان کی چیخیں نکل گئیں اور وہ کہنے لگے یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! میں تو خادم ہونے کیلئے آیا ہوں۔ [ے]

دیکھو یہ یقین کا اثر ہے جو حضرت عمرؓ پر ظاہر ہوا اور جس نے ان کے اندر ایک عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا۔ وہ پہلے بھی وہی قرآن سنتے تھے جو انہوں نے بعد میں سنا مگر جب ان کے کانوں میں ایک عورت کی یہ آواز پہنچی کہ میں ہر قربانی کرنے کیلئے تیار ہوں مگر اسلام کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ادھر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقرہ سنا کہ جس سچائی کو میں لے کر آیا ہوں ایک دن دنیا

اسے ماننے پر مجبور ہوگی وہ اسے قبول کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ گویا واقعات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے رنگ میں پیش کیا کہ جس میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تو اس یقین اور وثوق نے حضرت عمرؓ کی حالت بالکل بدل ڈالی۔

اسی طرح تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک شریر اور مفسد شخص تھا جو گو مسلمان کہلاتا تھا مگر اسلامی احکام پر ہمیشہ ہنسی اور تمسخر اُڑاتا رہتا۔ لوگ اسے بہت سمجھاتے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کئی سال کے بعد ایک دفعہ لوگوں نے اسے دیکھا کہ وہ حج کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر لوگ اس کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ تُو تو حج پر ہنسی کرتا اور مخول اُڑایا کرتا تھا مگر آج تُو خود حج کرنے کیلئے آ گیا یہ تغیر تیرے اندر کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ کہنے لگا بے شک آپ لوگ مجھے سمجھایا کرتے تھے مگر ہدایت کا کوئی خاص وقت ہوتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ گلی میں سے ایک شخص گذرا جو نہایت ہی دردناک لہجہ میں یہ آیت پڑھتا جارہا تھا کہ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ [8] کہ کیا مومنوں کیلئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ڈر سے بھر جائیں۔ معلوم نہیں اُس کے دل کی اس وقت کیا کیفیت تھی اور اس کے اندر کس قدر سوز اور درد بھرا ہوا تھا کہ میں یہ آیت سنتے ہی تڑپ اُٹھا اور میں اپنے گناہوں سے توبہ کر کے حج کیلئے چل پڑا۔ تو صداقت اور یقین سے جو تبلیغ کی جاتی ہے اس میں اور دوسری باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہی وہ باتیں ہوتی ہیں جو دوسرے کے قلب کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک جنگ سے واپس تشریف لائے تو ایک دشمن جس کے دو رشتے دار مسلمانوں کے ہاتھوں لڑائی میں مارے گئے تھے اس نے اپنی تلوار لی اور رسول کریم ﷺ کے تعاقب میں چل پڑا۔ ایک جنگل میں جب اسلامی لشکر پہنچا تو تمام لوگ آرام کرنے کیلئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ صحابہؓ گو رسول کریم ﷺ کا ہمیشہ پہرہ رکھتے تھے مگر اُس وقت انہوں نے خیال کیا کہ یہاں جنگل میں کون دشمن آنے لگا ہے اور سب اِدھر اُدھر درختوں کے نیچے سو گئے۔ رسول کریم ﷺ نے بھی اپنی تلوار ایک درخت کی شاخ میں لٹکا دی اور آرام کرنے کیلئے اُس درخت کے نیچے سو گئے۔ وہ شخص جو تعاقب میں تھا اسی موقع کا منتظر تھا۔ وہ جھٹ ایک جھاڑی کے پیچھے سے نکلا اور رسول کریم ﷺ کی تلوار اُس نے اُٹھالی۔ آہٹ پا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے جب آپ

کو جاگتے دیکھا تو تلوار سونت کر کہنے لگا بتا اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے لیٹے لیٹے ایک اطمینان اور یقین سے فرمایا کہ اللہ۔ اللہ کا لفظ لوگ ہزاروں دفعہ استعمال کرتے ہیں مگر کون ہے جس کے الفاظ میں وہ اثر ہو جو رسول کریم ﷺ کے الفاظ میں تھا۔ آپ نے جس یقین اور وثوق سے یہ لفظ استعمال کیا، وہ تلوار سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے دل میں اتر گیا۔ اور اس کا ایسا اثر اس پر پڑا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ رسول کریم ﷺ نے فوراً وہ تلوار اُٹھا کر پکڑ لی اور پھر اُس کے سر پر تلوار کھینچ کر فرمایا بتا اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا آپ ہی رحم کریں تو کریں۔ آپ نے فرمایا اے نادان! تُو نے پھر بھی سبق حاصل نہ کیا۔ کم از کم مجھ سے سن کر ہی تُو یہ کہہ دیتا ہے اللہ مجھے بچائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ رسول کریم ﷺ کو قتل کرنے کیلئے آیا تھا اور یا وہیں مسلمان ہو گیا۔[9]

تو دل سے نکلی ہوئی جو بات ہو اس کا رنگ بالکل اور قسم کا ہوا کرتا ہے لیکن اگر کسی کو اپنی بات پر ہی یقین نہ ہو تو اس نے اثر کیا کرنا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم میں سے صرف ایک بہادر آدمی اُٹھتا اور ساری قوم کو زندہ کر دیتا ہے۔ لیکن کئی آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی جانیں دے دیں گے مگر جب گھر سے نکلتے ہیں تو ایک قدم ان کا آگے اُٹھتا ہے اور ایک پیچھے۔ ایسے آدمیوں کا اپنی قوم میں کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ لوگ انہیں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ پس **كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ** کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے فطرتِ انسانی پر انسان کو کبھی بدگمانی نہیں کرنی چاہئے۔ یہ امر اچھی طرح یاد رکھو کہ ہر قوم میں نیکی پائی جاتی ہے۔ نیکی پر تمہارا کوئی ٹھیکہ نہیں۔ ہاں کامل ہدایت بیشک تمہارے سِوا اِس وقت کسی اور کے پاس نہیں مگر فطرتی نیکی سے نہ ایک ہندو محروم ہے، نہ سکھ محروم ہے، نہ عیسائی محروم ہے، نہ یہودی محروم ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو ہدایت کی طرف لاتی ہے۔ اور فطرتی نیکی کا انسان کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے انسان کے ساتھ اس کے پیروں کا۔ پیر جب چلتے ہیں تب تم اپنے کسی رشتہ دار یا دوست سے مل سکتے ہو۔ نہ چلیں تو نہیں مل سکتے۔ اسی طرح فطرتی نیکی ہی ہے جو کامل ہدایت تک پہنچاتی ہے یہ نہ ہو تو کامل ہدایت کسی انسان کو نہ مل سکے۔

پس بے شک خدا تعالیٰ کی کامل اور حقیقی محبت تمہارے دلوں میں ہی ہے مگر اس کی محبت کی جو جستجو اور تڑپ ہے۔ وہ ہر ایک شخص کے دل میں پائی جاتی ہے۔ پس اپنے آپ پر بھی بدظنی نہ کرو اور دوسروں پر بھی بدظنی نہ کرو۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم اس نکتہ کو سمجھ جاؤ تو تم اپنی بھی اصلاح کر لو گے اور

دوسروں کی بھی کیونکہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ جس نے اپنی ذات کونہیں پہچانا اس نے خدا کو بھی نہیں پہچانا۔ اور جس نے اپنی ذات کو پہچان لیا اس نے خدا کو بھی پہچان لیا۔ جس نے یہ سمجھا کہ میں گندہ ہوں اور خدا تعالیٰ کو نہیں مل سکتا وہ چونکہ اپنے آپ پر اور اپنے خدا پر بدظنی کرتا ہے اس لئے واقعہ میں اس کی محبت سے محروم رہتا ہے۔ مگر وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص کو خدا تعالیٰ نے اسی لئے بنایا ہے کہ اس کی رضا کا وارث ہو اور اس کی محبت کا حامل، اسے خدا تعالیٰ بہر حال مل جاتا ہے۔ پس انسان کو چاہئے کہ اپنے متعلق اور دوسرے لوگوں کے متعلق بدظنی کے مرض کو دور کرے اور اپنے اندر ایک یقین اور وثوق پیدا کرے۔ تب ہی اس کے اندر اُمنگیں پیدا ہوں گی اور تب ہی یہ لوگوں کی اصلاح کے کام میں کامیاب ہوگا اور اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام کوششیں رائیگاں اور فضول چلی جاتی ہیں۔

(الفضل ۲؍ جنوری ۱۹۳۸ء)

---

۱ الاعلیٰ: ۱۰

۲،۳ بخاری کتاب الجنائز باب ماقیل فی اولاد المشرکین میں یہ الفاظ ہیں۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ اوینصرانہ اویمجسانہٖ

۴ مسلم کتاب التوبة باب قبول التوبة ......الخ

۵ مسلم کتاب الایمان باب کون الاسلام یھدم ماقبلہ......الخ

۶ موضوعات ملا علی قاری صفحہ ۷۲ مطبوعہ دھلی ۱۳۴۶ھ

۷ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۳۶۶ تا ۳۷۱ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۸ الحدید: ۱۷

۹ شرح مواھب اللدنیه جلد ۲ صفحہ ۵۳۰ مطبوعہ بیروت ۱۹۹۶ء